Rizwan Ullah
D-178, Abul Fazl Enclave
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Tel: 9971283786
Email:ruilmi@rediffmail.com

اقوامِ عالم کے قبلہ نیویارک میں

رضوان اللہ

نیویارک کی شہرت اور عظمت کی کلغی کے کئی پر گر گئے لیکن اب بھی اس کی کشش میں کوئی کمی نہیں آئی ہے، دنیا اس کی گرویدہ اور مشتاق دید ہے۔ اس شہر جہاندار کے ساتھ تازہ ترین حادثہ ۹ ستمبر ۲۰۰۱ء کو پیش آیا جب اس کی مشہور ومعروف ورلڈ ٹریڈ سینٹر عمارت کے دونوں عظیم الشان ٹاورز زمین بوس ہو گئے، لیکن اس حادثے نے نیویارک کو ایک نئی تاریخی اہمیت عطا کی۔ اس تاریخ کے اوراق رفتہ رفتہ ساری دنیا پر کھلتے جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے جو واقعہ ہوا وہ دنیا کی طرف سے کسی خاص توجہ کا موجب نہ ہوا یعنی نیویارک کی بلند ترین عمارت امپائر اسٹیٹ سے زیادہ بلند عمارت سیرس ٹاور ۱۹۷۴ء میں شکاگو میں کھڑی ہو کر آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ اس سے پہلے بھی ایک واقعہ ایسا ہی ہوا تھا، جب ۱۹۳۷ء میں سانفرانسسکو میں دنیا کا اولین اور طویل ترین ہینگنگ برج گولڈن گیٹ وجود میں آیا اور نیویارک کے قدیم قوی ہیکل پلوں کو اوراق پارینہ بنا دیا۔

با اینہمہ عالمی اقتصادیات اور معیشت اسی شہر کے اشاروں پر گردش کرتی ہیں، ان کی طنابیں وال اسٹریٹ سے ہی کھینچتی ہیں۔ اسی شہر میں واقع ادارہ اقوام متحدہ ساری دنیا کی سیاست کی راہیں متعین کرتا ہے، جس کی پرشکوہ عمارت یو این پلازا ایسٹ ریور کے آئینے میں اپنی رعنائیوں کا ٹکٹکی باندھے مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ یہی ایک بڑی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے لوگ یہاں نظر آتے ہیں اور مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے اپنی تہذیبی شناخت کی وجہ سے پہچانے بھی جاتے ہیں۔ شہر کی تاریخ اور جغرافیہ کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں کہنا ہے کیونکہ پہلے اس شہر کے بارے میں کتابوں میں لکھا اور پڑھا جاتا تھا، اب قرطاسِ فلک پر ہر ممکن تفصیل انمٹ روشنائی سے درج ہے، جس کو ضرورت ہو یا جانکاری کا شوق ہو بس ایک بٹن دبا کر آنِ واحد میں دیکھ سکتا ہے۔ میں تو صرف اپنے مشاہدوں کے حوالے سے کچھ کہنا چاہوں گا۔ ہر کسی کے مشاہدے اور تجربے مختلف ہوا کرتے ہیں، پھر جہاں جلوؤں کی ایسی کثرت اور تنوعات کی بہتات ہو تو اس کا بیان کہاں تک کیا جا سکتا ہے۔

میں سہ پہر میں شکاگو سے روانہ ہو کر تقریباً تین گھنٹے کی پرواز کے بعد شام کو نیویارک پہنچا اور ایئرپورٹ سے سیدھا ایڈیسن ہوٹل چلا گیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد کلکتہ کے پرانے دوست ڈاکٹر قیصر بخت کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔

اگر ایئر پورٹ سے ان کو خبر کر دیتا تو وہ یقیناً مجھے وہیں سے اچک لیتے۔ امریکہ پہنچنے کے بعد ہی سے روزانہ ان سے ٹیلیفون پر گفتگو ہو جاتی تھی۔ ان کا اصرار تھا کہ نیویارک میں کم سے کم پندرہ دن میرے یہاں قیام کے لیے رکھنا۔ ڈاکٹر قیصر کلکتہ میں ہمارے دوستوں میں سے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں امریکہ چلے گئے مختلف شہروں کے ہسپتالوں میں سرجن کے طور پر خدمات انجام دینے کے بعد بالآخر نیویارک میں مستقلاً قیام پذیر ہو گئے۔ پھر کچھ دن بعد اپنی بیوہ ماں اور ایک چھوٹی بہن اور دو بھائیوں کو بھی وہیں بلا لیا۔ میرا ٹیلی فون ملتے ہی اصرار کرنے لگے کہ فوراً آ جاؤ، میں نے ان کو سمجھایا کہ میری ملاقاتوں کے کچھ پروگرام ہیں اس لیے ایک دن بعد آؤں گا۔

نیویارک پہنچنے کے بعد مجھے ایسا لگا کہ یہاں کچھ بھی نیا نہیں ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ چار ہفتوں سے امریکہ کے مختلف شہروں میں گھومتے ہوئے نئے پن کا احساس نہیں رہ گیا تھا، دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ نیویارک شہر پر پرانے پن کے ایسے آثار معلوم ہوتے تھے جو کلکتہ کے آثار سے مشابہ تھے۔ قصہ یوں ہے کہ یہ دونوں شہر برطانوی حکمرانی کے دوران چالیس پچاس برس کے فاصلے سے آباد ہو رہے تھے، شہروں اور ملکوں کے وجود کی تاریخ میں یہ کوئی بڑی لمبی مدت نہیں ہوا کرتی۔ چنانچہ تعمیرات کے طرز میں مشابہت تھی اور کلکتہ اور نیویارک کے درمیان تجارتی لین دین بھی ہو رہا تھا اس کے اثرات پوری معاشرت پر ہوتے ہیں، مزید یہ کہ نیویارک میں سیاہ فاموں کی آبادی بھی دوسرے شہروں میں ان کی آبادی کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ ہارلم کا ایک علاقہ ان کی آبادی کی کثرت والا ہے۔ پھر یہ کہ میں جس وقت سفر کیے جا رہا تھا وہ گرمی کا زمانہ تھا تو بہر حال موسم استوائی تھا، ہاں کلکتہ جیسی عرق ریزی نہیں تھی۔

اپنے ہوٹل میں پہنچنے کے بعد ڈاکٹر قیصر کو اطلاع تو کر دی تھی لیکن ایک روز کی مہلت بھی لے لی تھی تا کہ جو پروگرام طے ہیں ان کو نمٹا لوں، چنانچہ اگلے دن صبح کو غاربن پریس سینٹر گیا، وہاں مجھے ان سہولتوں سے آگاہ کیا گیا جو بیرونی اخبار نویسوں کو وہاں فراہم کی جاتی ہیں، جس سے انھیں اپنی پیشہ ورانہ کارگزاریوں کی انجام دہی میں مدد ملتی ہے۔ ہمارا اگلا پروگرام اے پی (ایسوسی ایٹڈ پریس) کا آفس تھا۔ وہاں ایڈیٹروں میں سے ایک موجود تھے انھوں نے ایجنسی کے مختلف شعبوں کی کارکردگی سے روشناس کرایا۔ میرے ایک سوال پر انھوں نے بتایا کہ اگر ٹریننگ کی غرض سے کوئی غیر ملکی اخبار نویس آتا ہے تو ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں، اسے ایک مہینے کی ٹریننگ کا موقع دیتے ہیں، لیکن اس کی مالی اعانت نہیں کر سکتے۔ وہ اس کو بھیجنے والے ادارے کی ذمہ داری ہے۔ میں نے اس امکان کو ذہن میں محفوظ رکھا تھا۔ کچھ دنوں بعد صحافیوں کے ایک ایکسچینج پروگرام کے تحت جانے والے امیدواروں میں ایک اردو اخبار نویس کا نام شامل کرنے کی کوشش کی، اس کو منظوری بھی مل گئی لیکن جب ان حضرت سے پاسپورٹ کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ پولیس نے بلا وجہ میرا پاسپورٹ ضبط کر رکھا ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا وہ قصہ وہیں ختم ہوا۔ اردو اخبار نویسوں کے احساس کمتری اور تنگ نظری کی مجھے بہتیری شکایتیں ہیں لیکن وہ معاملہ الگ ہی ہے۔ اس کو بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔

ایڈیسن ہوٹل میں جہاں میں قیام پذیر تھا اس کے آڈیٹوریم میں ایک ڈرامہ ''اوہ کلکتہ'' عرصہ دراز سے چل رہا تھا۔ خیال ہوا کہ اس میں کلکتہ سے متعلق کچھ ہوگا، اس لیے موقع ملے گا تو اسے بھی دیکھ لیں گے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ

جب شام کو ہوٹل میں واپس آیا تو اس ڈرامے کے دو کریڈٹی ٹکٹ رسپشن پر رکھے ہوئے تھے ممکن ہے وہ پبلسٹی کے طور پر کچھ کریڈٹی ٹکٹ ہوٹل کے مہمانوں کے لیے دیتے ہوں۔ میرے گروپ کے ایک ممبر جو ترک تھے، میرے ساتھ تھے۔ ہم دونوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تھیٹر کا رخ کیا۔ دراصل اس ڈرامے کی خصوصیت صرف اتنی تھی کہ دو عورتیں اور تین چار مردوں پر مشتمل پورا گروپ برہنہ تھا، ورنہ اس میں نہ کوئی تھیم تھا نہ ہی کلکتہ کا کوئی ذکر تھا، صرف ایک گیت کے ہر بند کے آخر میں ''اوہ کلکتہ'' کا کورس تھا۔ بہرحال یہ بھی ایک تجربہ تھا لیکن میرا قیاس نہیں یقین ہے کہ وہ برہنگی اصلی نہ تھی، بلکہ فریبِ نظر تھا جو اسٹیج پر مدھم روشنی میں نہایت باریک اور شفاف لباس کے ذریعے پیدا کیا گیا تھا۔ خیر!

اگلے دن صبح کو ڈاکٹر قیصر کی والدہ کا ٹیلی فون ملا وہ کہہ رہی تھیں: ''بیٹا قیصر سیڑھی پر سے گر گئے ہیں اور ان کی ایک ٹانگ اور ایک بازو فریکچر ہو گیا ہے اور وہ سب پلاسٹر کر دیا گیا ہے۔'' میں نے ان سے کہا میں کل آؤں گا، آج اس طرف کے کچھ اور کام نمٹا لوں۔ وہاں کچھ ہندوستانی دو اخبار نکالتے تھے۔ ان میں سے ایک ''انڈیا ابراڈ'' تھا اس کے ایڈیٹر سے ملاقات کرنی تھی۔ ان کے آفس پہنچا تو اخبار کے ایڈیٹر مسٹر گوپال راجو بڑی عجلت میں نکل کر کہیں بھاگے جا رہے تھے، بس ان سے صرف تعارف ہو سکا۔ اسٹاف کے دو ایک لوگ تھے ان سے اخبار کے مشمولات وغیرہ کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ اس واقعہ سے قطع نظر میرا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ وغیرہ میں مامور یا برسرِ کار ہندوستانی ہندوستانیوں کے ساتھ بڑی بے رخی کا سلوک کرتے ہیں، گویا وہ ناخواندہ اور ناپسندیدہ ہیں۔ مجھے لندن اور واشنگٹن میں ایسے ہی تجربے ہوئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ ان مناصب پر ماموری کو اپنی ایسی معراج سمجھتے ہیں کہ ہر ہندوستانی کمتر نظر آنے لگتا ہے۔ شاید یہ روایت قدیم ہے۔ مجھے یاد ہے کہ وزیراعظم نہرو کے زمانے میں جب ان کے چہیتے کرشنا مینن لندن میں ہائی کمشنر تھے تو ہندوستانی عملہ کے ساتھ بری طرح پیش آتے تھے۔ خوشونت سنگھ پریس سکریٹری کے طور پر مامور ہوئے تو ان کے ساتھ بھی وہی رویہ اختیار کیا۔ سردار جی اپنا استعفا ان کی میز پر رکھ کر چلے آئے۔ شاید مسٹر مینن سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ کوئی ہندوستانی ملازم استعفا بھی دے سکتا ہے۔

میں اگلے دن صبح کو ناشتے سے فراغت کے بعد ڈاکٹر قیصر کے یہاں جانے ہی والا تھا کہ ان کی والدہ کا ٹیلیفون آیا کہنے لگیں بیٹا قیصر تمھیں لینے کے لیے گئے ہیں، تم نیچے لابی میں ہی رہنا۔ ذرا دیر بعد دیکھتا ہوں کہ قیصر صاحب بندھے چھنے گدوں سے ٹیک لگائے گاڑی میں بیٹھے ہیں اور ان کی بیگم گاڑی ڈرائیو کرتی ہوئی آئیں۔ بس مجھ سے ڈاکٹر قیصر کے تعلق کی یہ انتہا تھی۔ پھر وہ مجھے اپنے گھر لے گئے جو ریوکلن کے ایک پاش علاقے میں واقع تھا۔

قصہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر قیصر کی رہائش سے کوئی سو سوا سو میل کے فاصلے پر ساحل کے قریب ان کی گرمائی رہائش کوئی ایک ایکٹر کے رقبے میں تھی، جہاں وہ گرمیوں میں دو مہینے قیام کرتے، بقیہ دس مہینے وہ مکان بند رہتا۔ دیکھ بھال کے لیے کوئی نگراں مقرر تھا۔ میرے قیام کی غرض سے اسی مکان کو ٹھیک ٹھاک کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں ایک سیڑھی لگا کر کوئی فریم لگا رہے تھے کہ سیڑھی پھسل گئی اور وہ بہت کافی زخمی ہو گئے۔ میں ان کے گھر پہنچا تو اس روز کہیں آنے جانے کا سوال ہی نہیں تھا، لیکن اگلے دن وہ سمر ہاؤس دکھانے کے لیے مجھے لے گئے۔ ان کی بیگم ہی ڈرائیو

کرتی رہیں، لیکن وہ نکل کر تھوڑا بہت چلتے پھرتے بھی تھے۔ وہ سارا علاقہ امریکی شہروں کی مصروف زندگی سے بالکل مختلف تھا، تھوڑے سے لوگ بڑے اطمینان سے خراماں خراماں بے فکری کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہاں امراء کی رہائشیں کم سے کم دو ایکڑ رقبے میں ہیں، اس دو ایکڑ کی تحدید سے پہلے ڈاکٹر قیصر نے ایک ایکڑ لے لیا تھا۔

وہاں ایک خاص چیز نظر آئی۔ ایک مقامی اسکول تھا، اس کے اندر لگی ایک تختی پر جلی حرفوں میں لکھا تھا کہ ''یہ اسکول ۱۷۳۰ء میں قائم ہوا'' اس تحریر سے نیویارک کا کلکتہ سے تعلق صاف ظاہر تھا۔ کلکتہ کے قیام کی تاریخ ۱۶۹۰ء ہے گویا نیویارک اس سے ۴۰-۵۰ برس پہلے آباد ہوا ہوگا۔ دونوں طرف آباد کار ایک ہی تھے یعنی انگریز اور چائے کے تاجر بھی وہی تھے جو کلکتہ بندرگاہ سے چائے لے کر امریکہ کہ مشرقی ساحلوں پر لنگر انداز ہوتے تھے۔ انہی رابطوں کی وجہ سے کلکتہ کی پرانی تعمیرات اور لندن اور نیویارک کے بعض حصوں کی تعمیرات میں مشابہتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ وہاں سے کچھ دور ایک شہر کے برابر رقبے میں پھیلا ہوا ملٹری اکادیمی کا کیمپس تھا، اس کے سامنے بہت بڑا میدان تھا، میں کیمپس کا فوٹو میدان کے ایک سرے سے لینا چاہتا تھا لیکن بن نہیں رہا تھا۔ ایک شخص کو اپنی طرف آتے دیکھا تو میں سمجھا کہ وہ اعتراض کرے گا لیکن اس نے مشورہ دیا کہ کس جگہ سے فوکس اچھا ہوگا۔ کیا آج ایسا ممکن ہوسکتا ہے؟ آج تو شاید کوئی دیکھتے ہی گولی مار دے گا۔ کیسی خوبصورت اور پرامن دنیا کیسی ہوگئی ہے کہ انسان اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگا ہے۔

اپنی تمام تکلیفوں کے باوجود قیصر صاحب نے اور ان کی اہلیہ نے میری بڑی پذیرائی کی اور تفریح کرانے کی کوشش کی لیکن میری کوشش بھی یہی تھی کہ ان لوگوں کو کم سے کم زحمت ہو۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ میں تنہا کہیں جاؤں یا خود کچھ خرچ کروں چنانچہ ان احتیاطوں کی وجہ سے بہت کچھ دیکھنے سے رہ گیا۔ اقوامِ متحدہ کی عمارت دیکھنے تو گیا لیکن وہاں زیادہ وقت نہیں نکال سکا، مگر ایک بات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

صرف بیس برس کے فاصلے سے دو عالمی جنگوں کے دوران کروڑوں انسانوں کی ہلاکت اور شہروں اور ملکوں کی بربادی اور سب سے بڑھ کر ایٹم بم کی تباہ کاری نے انسانیت کو لرزہ براندام کر دیا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد قائم ادارہ لیگ آف نیشنز کا تجربہ جنگ کو روکنے میں ناکام ہو چکا تھا، اس لیے دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر دنیا ایک ایسے ادارے کے قیام کے لیے بے چین تھی جو امن کا ضامن ہو سکے ایسے میں ادارہ اقوام متحدہ کا قیام طے پایا جس کے لیے منہٹن کی کونسل نے زمین کا عطیہ دیا اور راک فلر نے اس ۳۹ منزلہ تعمیر کے اخراجات کی کفالت کی جس میں ابتداءً ۵۱ اقوام کی رکنیت کے ساتھ وہ ادارہ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں قائم ہوا، جس کے ممبروں کی تعداد آج ۱۹۵ تک پہنچ گئی ہے۔ اس کی تفصیلات کے لیے تو ایک کتاب درکار ہے میں صرف ایک اسٹیچو کا اس وقت ذکر کرنا چاہوں گا جو امن کی علامت، امن کی ترغیب کے علاہ اقوامِ متحدہ کی روح کی ترجمانی کرتا ہے۔

اصل عمارت کے باہر لان میں ہرکولیس ٹائپ کے ایک بڑے قوی الجثہ انسان کا مجسمہ ہے جس نے اپنی بڑی سی چوڑی چکلی تلوار کی نوک کو زمین پر رکھ کر اس کا دستہ پکڑ کر اتنا زور لگایا ہے کہ تلوار مڑ کر ہل کر طرح ہوگئی ہے اور

وہ دوسرے ہاتھ میں ہتھوڑا لے کر اس کو ٹھونکنے والا ہے۔ اس کے نیچے مجسمے کے چبوترے پر یہ عبارت درج ہے ''تلوار کو موڑ کر ہل بنا دو۔'' کیسا خوبصورت تصور ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ مجسمہ اس وقت کے سویٹ یونین کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر قیصر اور ان کی اہلیہ نے جو فلپائنی تھیں تین چار دن میری میزبانی کے بعد تحفے تحائف دے کر مجھے رخصت کیا۔ ڈاکٹر قیصر پابند صوم وصلات ہونے کے علاوہ جماعت اسلامی کے نظریات سے بہت متاثر تھے۔ جس وقت ان کا ایکسیڈنٹ ہوا اس وقت بھی وہ روزہ سے تھے۔ واشنگٹن روانگی کے لیے وہ مجھے ہوائی اڈے تک چھوڑنے بھی آئے۔

امریکہ میں منتخب عہدے

اگرچہ امریکہ میں واحد وفاقی حکومت ہے لیکن اس میں حسبِ ذیل شامل ہیں

۵۰ ریاستی حکومتیں

۳ لاکھ سے زیادہ عہدے مقامی حکومتوں کے (کاؤنٹی، سٹی اور ٹاؤن کی)

اور تقریباً ۲ لاکھ مخصوص مقاصد کے اضلاع جیسے کہ اسکولی اضلاح، پانی کے اضلاع، نتیجے کے طور پر امریکی ووٹروں کو صرف صدر اور کانگریس (پارلیمنٹ) کے لیے نہیں ووٹ دینا ہوتا ہے بلکہ ریاستی اور مقامی حکومت کے ہزاروں عہدیداروں کے لیے بھی ووٹ دینا ہوتا ہے جن میں ریاستی قانون ساز ممبر، ریاستی گورنر اور لیفٹیننٹ گورنر، ریاستی آڈیٹر، کاؤنٹی کمشنر، ٹاؤن اور سٹی میئر، ایلڈرمین، جج، کانسٹبل، مجسٹریٹ، شریف، جسٹس آف پیس اور اسکول بورڈ، کالج بورڈ، یوٹیلٹی بورڈ کے ممبران اور عوامی ٹرسٹ کے عہدیدار شامل ہیں۔

کچھ غیر معمولی قسم کے منتخب عہدے بھی ہیں جیسے کاؤنٹی کورونر، آبپاشی اضلاع اور ٹاؤن سمڑی کمیشنوں کے ممبر اور درختوں کے وارڈن یعنی وہ افسران جو شہری املاک پر مخدوش درختوں کو ہٹانے کی نگرانی کرتے ہیں۔